مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور پاکستان

حفصہ نسرین☆

مولانا ابوالحسن علی ندوی عصر حاضر کے ممتاز عالم دین، امت مسلمہ کے مصلح اور عربی و اردو زبانوں کے ماہر ادیب تھے۔ ان کا تعلق اگر چہ ہندوستان سے تھا، لیکن ان کی عظیم علمی شخصیت کو تمام عالم اسلام میں جو اکرام و احترام حاصل تھا، وہ محتاج بیان نہیں۔ انہوں نے تمام عمر امت مسلمہ کی زبوں حالی کے خاتمے کے لیے خلوص سے سعی و جہد کی۔ تمام اسلامی ممالک میں گئے اور وہاں کے حالات کا بخوبی جائزہ لیا، محاسن کو سراہا اور معائب کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے سد باب کے لیے رہنمائی بھی کی.

مولانا تحریک پاکستان کے عینی شاہدین میں سے تھے۔ تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے تمام واقعات ان کے سامنے پیش آئے۔ تحریک پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ تھا۔ ہندو دھرم اور اسلام دو مختلف مذاہب ہی نہیں، درحقیقت دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ زبان و ادب، فنون لطیفہ، فن تعمیر، نام و نسب، اقدار، قانون، رسم و رواج، روایات، رجحانات و مقاصد ہر لحاظ سے مسلمانوں کا اپنا انفرادی نظام ہے، فلسفۂ حیات ہے۔ اس کے برعکس ہندو دھرم میں لچک و وسعت ہے۔ یہ دوسری قوموں کی تہذیب کو اپنے اندر ضم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اپنے رسوم رواج تک بدل لیتا ہے۔

اسلامی ہند کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے حاکم ہونے کے باوجود ہندوؤں نے کبھی ان کو دل سے قبول نہیں کیا اور یہی کوشش کی کہ مسلمانوں کو اپنے سانچے میں ڈھال لیں۔ لہٰذا رام کو رحمٰن اور کرشن کو کریم ثابت کرنے کی مہم کا آغاز ہوا جو کہ اسلامی عقائد پر کاری ضرب تھی۔ انگریزوں کی برصغیر آمد پر ہندو ان کے ساتھ گھل مل گئے، ان کو زیادہ مراعات ملتی رہیں۔ انہوں نے اپنی

☆ مدیر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

تہذیب کو انگریزی تہذیب سے الگ رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی، جب کہ مسلمان الگ قوم کی حیثیت سے رہنا چاہتے تھے، انگریزوں کو علم تھا کہ ہندو ان کی قوم میں ضم ہو سکتے ہیں مسلمان نہیں، لہٰذا مسلمانوں پر ابتداءً معاشی راہیں بند کی گئیں، اس کے بعد اسلامی تعلیمات کی تضحیک، عربی و فارسی اور پھر اردو کی بیخ کنی، مقدس مقامات اور اکابر دین کی بے حرمتی کے متعدد واقعات سامنے آنے لگے، مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں پر زندگی کے تمام دروازے بند کیے جانے لگے، بحیثیت قوم ان کو ذلیل کیا جانے لگا، لہٰذا ان میں مایوسی اور پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ (۱) ان حالات میں سرسید احمد خاں نے اصلاح کا آغاز کیا۔ ابتداء میں ان کا خیال تھا کہ ہندو مسلم اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ البتہ بعد میں انہوں نے محسوس کیا کہ اب یہ دونوں قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ مولانا محمد علی جوہر کا تھا۔ بعد میں یہ دونوں حضرات اس بات کے قائل ہو گئے کہ مسلم قومیت کی بنیاد نسل و وطن پر نہیں، بلکہ کفر ایک ملت ہے اسلام ایک ملت۔ البتہ اس نظریہ کو زبان علامہ اقبال نے دی۔

۱۹۱۵ء میں علی گڑھ میں علامہ اقبال نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کی دیگر قوموں اور مسلمانوں میں اصولی فرق یہی ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری قوموں کے تصور سے بالکل مختلف ہے اس کی بنیاد نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن ..... بلکہ ہم سب کے متعلقات کا سرچشمہ ایک ہے۔ (۲)

۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کے اجلاس میں علامہ اقبال نے خطبۂ صدارت میں اپنے نظریہ کی وضاحت یوں کی کہ اہل مغرب کے ہاں مذہب فرد کی ذاتی زندگی کا معاملہ ہے جب کہ اسلام کی رو سے مذہب زندگی کے ہر معاملہ پر محیط ہے۔ اس موقعہ پر علامہ نے کھل کر اس بات کا اظہار کیا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی تہذیبی و ثقافتی اور تمدنی، سماجی و اقتصادی اختلافات اس قدر بنیادی ہیں کہ یہ کبھی دور نہیں ہو سکتے، مسلمانوں کے حقوق صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتے ہیں کہ انہیں اپنے مذہب اور تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت دی جائے، اس طرح مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک ریاست بنائی جائے۔ جس میں مسلمان آزادی سے اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل پیرا ہو سکیں۔ (۳)

۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد کے بعد علامہ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس میں بھی

مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کا کھل کر دفاع کیا، یوں انہوں نے اپنی قوم کے لیے منزل کی نشاندہی کر دی اور اس کی راہ کی طرف ان کو گامزن کر دیا، قائداعظم کو ان کی رہنمائی پر آمادہ کیا ہے (۴) علامہ نے اپنی تمام توانائیاں اور قابلیتیں مسلمانوں کی آزادی اور اسلام کی سربلندی کے لیے صرف کر دیں.

تحریک پاکستان کو موافقت اور مخالفت دونوں کا سامنا کرنا پڑا، علمائے کرام کا ایک گروہ ایسا تھا جو اس کی مخالفت میں تھا۔ اس سلسلہ میں نمایاں کردار مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی وغیرہ کا ہے۔ چنانچہ قومیت کے تصور پر علامہ اقبال اور شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مولانا مدنی کے مابین تند و تیز مباحثہ ہو۔ (۵) مولانا مدنی سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کا خاص تعلق خاطر تھا، لہٰذا مولانا علی میاں کی حمایت مولانا مدنی کے ساتھ تھی..... مختصراً علامہ اقبال کے نظریہ کو قائداعظم کی قیادت ملی اور بے شمار مسلمانوں کی انتھک کوششوں اور قربانیوں کے نتیجہ میں ایک آزاد مملکت وجود میں آئی.

مولانا علی میاں کے پیر و مرشد حضرت عبدالقادر رائے پوری بھی تقسیم کے خلاف تھے۔ ان کے خیال کے مطابق مسلمانوں کا متحد رہنا زیادہ ضروری اور سودمند ثابت ہوسکتا تھا۔ البتہ مولانا علی میاں کا نظریہ تحریک پاکستان کے حوالہ سے کھل کر سامنے نہیں آیا۔ تاہم ان کے ایک دو بیانات ایسے ملتے ہیں جن سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تقسیم کو ناپسند کرتے تھے اور برصغیر کو ایک اکائی کی صورت میں دیکھنا پسند کرتے تھے، مثلاً لکھتے ہیں ''میں اور میرا پورا گھرانہ بلکہ پوری جماعت کا رجحان جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کی طرف تھا اور ہم تقسیم کو ملک کے لیے مضر سمجھتے تھے، تقسیم سے پہلے اس مسلک کے علماء و قائدین بالخصوص مولانا مدنی کے ساتھ تحریک پاکستان کے پرجوش حامیوں نے جو سلوک کیا۔ اس سے ہمارے دل مجروح تھے۔'' (۶) اپنے اسی نظریہ کا اظہار انہوں نے ۱۹۵۴ء میں پاکستان کے پہلے دورہ میں کیا ''پاکستان کے نظریہ سے اگرچہ اس وقت اصولاً اختلاف تھا اور ایک بلندتر اخلاقی، روحانی، انسانی اور اسلامی زندگی کا نمونہ قائم کر کے وہاں اکثریت کو دین فطرت سے مشرف کرنے کے کام کو زیادہ ضروری و مفید سمجھتا تھا اور میرے نزدیک اس کے روشن امکانات تھے۔ (۷) اس مخالفت کا سبب صرف یہی تھا کہ ایک الگ ملک بن جانے کی صورت میں مسلمانوں کی

متحدہ قوت پر ضرب پڑتی۔ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان نسبتاً کمزور پڑ جاتے اور پاکستان آنے والے اپنے نئے مسائل سے نبرد آزما ہو کر اپنے اصل مقصد یعنی امت مسلمہ کے بھرپور تشخص کو ابھار کر سامنے لانے سے ہٹ جاتے۔

مولانا ،علامہ اقبال کے بہت بڑے مداح تھے اور ان کے افکار سے متاثر بھی۔ اس کی دلیل ان کی کتاب ''روائع اقبال'' ہے۔ مولانا کی تقاریر سے (جو انہوں نے پاکستان کے مختلف دوروں میں کیں) یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ ہندومت میں جو وسعت اور لچک ہے اس کی وجہ سے وہ ہر نئی چیز کے ساتھ بخوبی مدغم ہو جاتا ہے، مثلاً مغرب کا نظام تعلیم جب ہندوستان آیا تو اس نے ہندو سوسائٹی میں کوئی بے چینی پیدا نہیں کی، البتہ مسئلہ مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ مسلم معاشرہ کی اپنی حدود ہیں جو کسی نئے تمدن کو بلا پس و پیش قبول نہیں کر سکتیں۔ (۸) گویا وہ سمجھتے تھے کہ ہندو اور مسلمان کبھی بھی ایک تہذیب کا حصہ نہیں بن سکتے۔ ان میں جو اختلاف ہے اور جو بُعد ہے اس کا خاتمہ ناممکن ہے، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ علی میاں کسی نہ کسی حد تک دو قومی نظریہ سے متفق تھے۔

البتہ چونکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ بہت مخلص تھے، لہٰذا انہوں نے پاکستان بننے کے بعد کبھی بھی اس کی مخالفت و بدخواہی نہیں کی، بلکہ پاکستان کے متعلق ان کے خیالات ہمیشہ بہت مثبت رہے۔ یہ مملکت جو اسلام کے نام پر قائم کی گئی تھی، اس سے مولانا کو خاص توقعات تھیں وہ چاہتے تھے کہ پاکستان جو ایک مسافر کی مانند ایک نئے راستے پر چلا ہے اس کو اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے جن قربانیوں کی ضرورت ہے اہل پاکستان اس سے گریز نہ کریں۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ ملک واقعتاً اسلام کا قلعہ بنے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ سب لوگ جماعتی و انفرادی مفاد کی سطح سے اوپر اٹھ کر دیکھیں۔ پاکستان جس وحدت اسلامی کی بنیاد پر بنا ہے، اس کی قدر کی جائے وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ اسلام کو نافذ ہونے کے لیے اقتدار کی ضرورت ہے اور یہ ملک جسے تمام عالم اسلام کے لیے مددگار و معاون ہونا چاہیے، تبھی عالم اسلام میں کوئی اہم کردار ادا کر سکے گا جب یہاں امتیازی سلوک نہ ہو، مساوات نہ ہو، یعنی ملکی مسائل کم سے کم ہوں تا کہ اقوام عالم کے مابین صحیح اسلامی تشخص کو ابھارا جا سکے۔ پاکستان کی تعمیر کو ایک مسجد کی طرح مقدس سمجھا جائے اور بلا طمع اس کی تعمیر میں حصہ لیا جائے، تعلیم کے حوالہ سے مولانا علی میاں، علامہ اقبال کے نظریات کے نظریات کی ترویج کر رہے

تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں نئی نسل کو ایسی تعلیم دی جائے جس میں علم و دین کے مابین خلیج نہ ہو۔ ان کے خیال کے مطابق پاکستان کو اقبال کی ضرب کلیم کی ضرورت تھی۔ مولانا کو قوی امید تھی کہ پاکستان ہی ثابت کرے گا کہ باقی عرب و اسلامی ممالک کی ذمہ داری کو اس نے بطریق احسن نبھایا ہے۔

مولانا نے پاکستان کے متعدد دورے کیے اور پاکستان کے متعلق اپنی خواہشات ونظریات کے اظہار کے ساتھ اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی اور ان کی اصلاح کے لیے ہدایات بھی دیں، ذیل میں ان کے پاکستان کے دوروں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے:

تقسیم سے قبل بھی کئی بار علی میاں لاہور آئے۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد انہوں نے پاکستان کا پہلا سفر ۱۹۵۴ء میں کیا۔ اس سفر میں وہ لاہور آئے اور دو تین دن کے قیام کے بعد راولپنڈی اور مری گئے اور حضرت رائے پوری کے ساتھ قیام کیا، پھر لاہور آ گئے۔ لاہور کے متعلق انہوں نے اپنے نظریات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ''لاہور میرے لیے لکھنؤ اور رائے بریلی کے بعد سب سے زیادہ مانوس شہر تھا۔ میں نے وہاں اپنی طالب علمی کی ایک خوش گوار مدت گزاری اور مختلف موقعوں پر کئی کئی مہینے کا خوشگوار قیام کیا۔'' (۹)

اس کے بعد اگلے ہی سال ۱۹۵۵ء میں پھر لاہور آئے اور پشاور و کوہاٹ کا دورہ کیا۔ لاہور کے انہی اولین سفروں میں سے ایک سفر میں ان کے اعزاز میں جامعہ سلفیہ میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں مولانا سید داؤد غزنوی نے ان کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پڑھا۔ (۱۰)

ان کے مرشد حضرت رائے پوری اکثر و بیشتر پاکستان آیا کرتے تھے، اور اکثر مولانا بھی ان کی معیت میں ہوتے، تاہم یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہر بار ان کے ساتھ پاکستان آئے یا نہیں، البتہ اپنے آخری دورہ ۱۹۶۲ء میں وہ پاکستان آ کر مرض الموت میں مبتلا ہو گئے اور ان کی واپسی ممکن نہ رہی۔ اس سفر میں مولانا علی میاں ان کے ساتھ نہ تھے، لیکن جونہی ان کی ناسازیٔ طبع کا علم مولانا کو ہوا وہ فوراً پاکستان آ گئے اور حضرت کی وفات کے وقت ان کے پاس ہی تھے۔ (۱۱) ان کی تدفین کے بعد وہ ہندوستان واپس چلے گئے۔

اس کے بعد ۱۹۷۸ء میں رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی جانب سے کراچی میں منعقد ہونے

والی پہلی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی آئے۔اس کانفرنس میں، جس میں بڑے بڑے علماء وفضلاء نے شرکت کی، مولانا نے ''دین کی حفاظت اور اس کے اصل شکل میں برقرار رہنے کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا۔ اس کانفرنس کا خاتمہ ۹ جولائی کو ہوا۔ اس کے بعد ۱۲ جولائی کو کراچی یونیورسٹی میں ایک تقریب میں تقریر کی جس میں تعلیم کے معنی ومفہوم اور تقاضے کے موضوع پر تفصیلاً گفتگو کی۔اس تقریر میں اہل پاکستان کی توجہ ان کی ذمہ داریوں کی طرف اس انداز میں مبذول کروائی ''اس وقت پاکستان کو ایک ضرب کلیمی کی ضرورت ہے، بلکہ تمام عرب اور اسلامی ممالک میں بھی زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کی ذمہ داری پاکستان پر ہے۔ اسلام کے عقائد وحقائق پر ایک نیا یقین، ایک نیا اعتماد، نیا سرور، نیا ولولہ، نیا نشہ، نئی جرأت انداز، نئی لذت کردار، نیا جذب دروں پیدا کرلے جس سے ان اونگھتی ہوئی قوموں کو آمادۂ زوال، ان مرتعش قوموں کو جن کے قدم بھی ڈگمگا رہے ہیں، دل بھی ڈگمگا رہے ہیں، ان کو نئی زندگی، نئے جوش سے آشنا کریں، پاکستان ایک معمل، ایک تجربہ گاہ ہے جو یہ ثابت کرے گا کہ اسلامی نظریات اس دور میں بھی مل سکتے ہیں۔ (۱۲)، اسی دن دارالعلوم کورنگی کراچی میں ''علوم دینیہ کے طلبہ وفضلاء کی کامیابی کی تین لازوال شرطیں'' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے طلبہ کو نصیحت کی کہ بدلتے زمانے کے اطوار کو پہنچانتے ہوئے اپنی حدود میں رہتے ہوئے اس انداز میں بدلیں کہ ترقی بھی کرسکیں اور الحاد سے بھی بچ جائیں۔ خود میں قناعت، استغناء و بے غرضی پیدا کریں۔ دینی و دنیوی دونوں قسم کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ علوم و فنون اور قدیم وجدید کے امتزاج میں مہارت تامہ پیدا کریں۔ (۱۳)

۱۳ جولائی کو مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی میں ''یہ دین زندہ ہے اور زندوں سے قائم ہے'' کے موضوع پر تقریر کی جس میں انہوں نے پاکستان کے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ ملک میں ایسے علما ہونے چاہئیں جو کہ نئے مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے حل پیش کریں۔ مدارس کے لیے ضروری ہے کہ مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا یوسف بنوری کے پائے کے علماء پیدا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں۔ (۱۴)۔۱۳ جولائی کو ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ''ملی وحدت اور اس کے تقاضے'' کے موضوع پر ہونے والے سیمینار میں شرکت کی، یہ تقریب انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کراچی میں ہوئی۔ اس میں مولانا نے وحدت کے معنی اس کی ساخت، اسلامی وحدت کے

مفہوم، وحدت اسلامی کے منصب کی اہمیت وعظمت اور اس کی بدولت حاصل ہونے والے ثمرات بیان کیے۔(۱۵)

بعدازاں ۱۸ جولائی کو اسلام آباد کے ہوٹل ہال میں ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا گیا۔اسی میں مولانا نے اندلس کی تباہی کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے عالم اسلام کی زبوں حالی پر تبصرہ کیا اور اندلس کے مسلمانوں کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے ہوئے شریعت اسلامیہ کے فوری نفاذ کی ضرورت واہمیت پر زور دیا۔اسی دن علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں اسلامی ممالک میں ذہنی کشمکش اور اس کے اسباب'' پر تقریر کرتے ہوئے کہا''اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو تمام غیر اسلامی چیزوں کو من وعن تسلیم نہیں کر سکتا، لہٰذا ایسا نظام تعلیم بنانے کی ضرورت ہے جو جدیدیت سے متاثر ذہنوں کو مطمئن کر سکے،لہٰذا تعلیم اور معاشرے مابین پایا جانے والا تضاد ختم ہونا چاہیے۔(۱۶)

۱۹ جولائی کو مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک میں تقریر کی اور جہاد کی اہمیت وضرورت اور اس کے بنیادی اصول بیان کیے۔دارالعلوم حقانیہ کی اہمیت اور اس کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی کامیابی کے لیے دعا کی۔(۱۷)

۲۴ جولائی کو جامع مسجد فیصل آباد میں''علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوے انہوں نے علماء کی اس ذمہ داری پر زور دیا کہ وہ اسلام کو اس انداز میں پیش کریں کہ وہ مسیحیت کی مانند نہیں ، بلکہ وہ اپنی اسی روح کے ساتھ نہ صرف زندگی کا ساتھ دے سکتا ہے بلکہ اس میں رہنمائی کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے،لہٰذا فرقہ پرستی اور نام ونمود کی سطح سے اوپر اٹھ کر اسلام کی خدمت کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔(۱۸)

۲۳ جولائی ۱۹۷۸ء کو''زرعی یونیورسٹی فیصل آباد''میں''زرخیز زمین مردم خیز خطہ'' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوے طلباء کو نصیحت کی کہ وہ نئی ایجادات کریں اور مغربی دنیا میں اپنا نام ومقام بنا سکیں۔(۱۹) اسی دن جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں''عہد حاضر کا چیلنج اور امت محمدیہ کے فرائض'' پر تقریر کرتے ہوئے راسخ العلم اور راسخ العقیدہ لوگوں کی ضرورت واہمیت پر زور دیا ہے۔(۲۰)

۲۵ جولائی کو جامعہ پنجاب لاہور میں اسلامی جمعیت طلبہ کے کیمپ میں

''محبت مجھے ان جوانوں سے ہے

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند''

کے موضوع پر تقریر کی۔ جس میں طلباء کو سیرت و کردار سازی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ بتایا کہ مشکل و کٹھن حالات ہی انسان کو ترقی و کامیابی کی طرف لے جاتے ہیں.

۲۶ جولائی کو ڈاکٹر اسرار احمد کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں قرآنی مطالعہ اور اس کے آداب کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے مومن کی زندگی میں قرآن کی اہمیت، حکمت دعوتِ قرآن وغیرہ کی تفصیل بیان کی اور یہ نصیحت کی کہ قرآن کو رشد و ہدایت کے لیے بنیاد بنایا جائے۔(۲۱)

۲۷ جولائی کو خدا کی بستی دکان نہیں ہے'' کے موضوع پر محکمۂ اوقاف کے صدر دفتر میں وقف کی ضرورت و اہمیت اور اس کے اصول و قوانین، امت مسلمہ کی زبوں حالی پر روشنی ڈالی اور یہ رائے دی کہ محکمۂ اوقاف کی مساجد کے ائمہ اصلاح امت کی کوشش کریں اور ایک اہم نکتہ کی جانب توجہ دلائی کہ فقہی مسائل مساجد کے اندر کا موضوع ہیں، ان پر کھلے عام بحث بہت بڑے فساد کا باعث بن سکتی ہے۔(۲۲)

ان تمام تقاریر میں خود مولانا کے الفاظ میں ''سامعین کے سامنے وہ حقائق رکھے گئے جن کا ادراک بعض اوقات باہر کا رہنے والا گھر میں رہنے اور ہر وقت کے دیکھنے والوں سے زیادہ کر سکتا ہے کہ ایک خاص روشنی اور ایک خاص درجہ حرارت و برودت میں رہنے والے اس ماحول کے عادی ہو جاتے ہیں اور اسی زاویۂ نظر سے دیکھتے اور سنتے ہیں، چنانچہ ان تمام تقاریر میں قدر مشترک پاکستانی بھائیوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانا اور اس بڑے اعلان و دعویٰ کی نزاکت و عظمت یاد دلانا تھا جس پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا (۲۳)۔

۱۹۷۸ء کے بعد مولانا علی میاں ۱۹۸۴ء میں پاکستان آئے، ۲۳ مئی کو کراچی آمد ہوئی آپ کا یہ دورہ چار روز پر مشتمل تھا.

۲۵ مئی ۱۹۸۴ء کو جامع مسجد بنوری ٹاؤن میں ملک و قوم کی سطح پر اسلامی معاشرہ کی

ضرورت پر زور دیا۔ آنحضورؐ کے برپا کیے ہوئے انقلاب اور اس کے نتیجہ میں سامنے آنے والے معاشرہ کی مثال دے کر یہ واضح کیا کہ صالح معاشرہ کس طرح قیام پذیر ہوسکتا ہے۔ (۲۴)

۲۵ مئی کو مؤتمر عالم اسلامی کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ اور عشائیہ کے موقع پر بہادر یار جنگ اکیڈمی میں، تقریر کی، کہا جس میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی اور اس کے برعکس اصلاح معاشرہ کی ضرورت و اہمیت پر سیر حاصل بحث کی (۲۵)

۲۶ مئی کو کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ وطلبہ کے ایک جلسہ کو خطاب کیا جس کا مرکز ومحور طلبہ اور نوجوانوں کی سیرت وکردار اور ضبط نفس کی ضرورت ولزوم تھا۔ (۲۶)

۲۷ مئی کو فاران کلب کی جانب سے کراچی، میٹروپول ہوٹل میں ایک جلسہ ہوا جس میں مولانا نے ''صحیح اسلامی اقدار کی ذمہ داری اور اس کی برکات'' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے صوبائی ولسانی تعصب کے نقصانات پر روشنی ڈالی۔ (۲۷)

۲۹ مئی کو مولانا کی لکھنؤ روانگی پر آپ کے اس دورۂ پاکستان کا اختتام ہوا۔

اس کے بعد مولانا ۱۹۷۶ء جون میں کراچی آئے اور اس دورہ میں سب سے اہم تقریر ۲۹ جون کی شام کراچی میں فاران کلب سے جانب سے دیئے گئے عصرانہ کے موقع پر ہوٹل میٹروپول میں کی۔ اس کا موضوع ''اسلامی معاشرہ کو درپیش حقیقی خطرات اور ان کا سدباب'' تھا۔ یہ تقریر ان تاثرات و مشاہدات پر مبنی تھی جو پاکستان کے مختصر اور طویل قیام کے دوران بار بار سامنے آتے رہے۔ اس میں مولانا نے فکری انتشار، دولت کے ارتکاز اور اس کی نمائش پر تفصیلی بحث کی۔ (۲۸)

ایک تقریر بنوری ٹاؤن کی جامع مسجد میں کی گئی، جو شکر کے موضوع پر تھی اور یہ کہ طریقۂ فکر اور طرز عمل حقیقت پسندانہ، ایجابی وتعمیری ہونا چاہیے۔

علاوہ ازیں عربی مدارس، مراکز اور چھوٹے اجتماعات میں بھی تقریریں کی گئیں جن میں ترقی، لسانی علاقائی ونسلی عصبیت کے خطرہ کی آگاہی اور تعلیم وتربیت کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا گیا (۲۹).

مولانا آخری بار ۱۹۹۷ء میں آئے جب وہ عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لیے تشریف لائے، جس کا موضوع بحث ''حرمین شریفین کے سفرنامے جدید

تحدیات کے تناظر میں تھا'' اس سیمینار میں شرکت کے علاوہ شیراں والا مسجد، علامہ اقبال کے مزار، شاہی مسجد، اورینٹل کالج گئے، جامعہ اشرفیہ کے قیام کے بعد واپس آ گئے یہ پاکستان کا آخری دورہ تھا (۳۰)۔

ان کی تمام تقاریر کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مولانا درحقیقت مسلمانوں کے لیے بہت مخلص اور دردمند تھے۔ ان کی سوچ کا مرکز ومحور یہی تھا کہ کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جائے کہ مسلمان الحاد و بے دینی کی طرف ہی نہ جائیں اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ چلتے ہوئے ترقی کی منازل بھی طے کریں۔ ان کی سوانح حیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جس اسلامی ملک میں گئے وہاں لوگوں کو مخاطب کر کے نصیحت کی۔ پاکستان کے متعلق بھی ان کا رویہ یہی تھا۔ انہوں نے ایک ماہر نباض کی طرح پاکستان کے مسائل کا جائزہ لیا ان کی نشان دہی کی اور اہل پاکستان کو ان کی کمزوریوں سے بھی آگاہ کیا جو آگے چل کر ان کی تباہی کا باعث بن سکتی ہیں.

حوالہ جات وحواشی

۱۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ مقالہ ''پاکستان''

۲۔وحید ظفر قریشی، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور ۱۹۷۳ء، ص: ۱۹

۳۔سید سلیم، تاریخ نظریہ پاکستان، ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور اشاعت سوم، ۱۹۹۶ء، ص ۳۱۶۔

۴۔محمد منور پروفیسر، تحریک پاکستان تاریخی خدوخال، ترجمہ محمد یوسف خان، راولپنڈی، ۱۹۹۲ء،:

۵۔تفصیل کے لیے دیکھیے منشی عبدالرحمٰن خان، تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی، ادارۂ اسلامیات طبع دوم ۱۹۹۲ء

،ایچ۔بی۔خان، برصغیر پاک وہند کی سیاست میں علماء کا کردار (بیسویں صدی میں ۱۹۴۰ء تک) قومی ادارہ برائے تحقیق وثقافت، اسلام آباد طبع اول ۱۹۸۵ء، حبیب احمد تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، البیان انارکلی لاہور، ت ن

۶۔ندوی ابوالحسن، حدیث پاکستان (مرتب فضل ربی ندوی) مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص: ۱۰۳

۷۔ندوی، کاروان زندگی، مجلس نشریات اسلام کراچی، ت ن، ج:، ص ۳۴۲۔

۸۔ایضاً، ص: ۴۰۸

۹۔ ایضاً، ص: ۴۰۷۔۴۰۸

۱۰۔ایضاً، ص: ۴۰۹۔۴۱۰

۱۱۔ندوی ابوالحسن علی، سوانح حضرت عبدالقادر رائے پوری، مکتبہ رشیدیہ لاہور، طبع اول ۱۹۷۷ء، ص ۲۱۸

۱۲۔ندوی، حدیث پاکستان (مرتب فضل ربی ندوی) مجلس نشریات اسلام کراچی، ص: ۹۸

۱۳۔ایضاً ص: ۱۵۸۔۱۶۷

۱۴۔ایضاً، ص: ۱۶۷۔۱۷۹

۱۵۔ایضاً ص: ۱۶۷۔۱۷۹

۱۶۔ایضاً ص: ۱۶۷۔۱۷۹

۱۷۔ندوی، کاروانِ زندگی، ۲: ۲۵۹۔۲۶۰

۱۸۔ ایضاً، ص: ۲: ۲۵۹۔۲۶۰

۱۹۔ایضاً: ۵۹۔۶۹

۲۰۔ایضاً، ص: ۱۰۹۔۱۱۷

۲۱۔ایضاً،ص:۱۳۲۔۱۴۵

۲۲۔ایضاً،ص: ۱۴۶۔۱۵۷

۲۳۔ایضاً ص:۷۰۔۸۰

۲۴۔ندوی،کاروان زندگی،۲:۲۶۰۔۲۶۱

۲۵۔ندوی،تحفۂ پاکستان (مرتب فضل ربی ندوی) مجلس نشریات اسلام کراچی،ص:۱۵۔۲۷

۲۶۔ایضاً،ص:۲۸۔۴۰

۲۷۔ندوی،کاروانِ زندگی،۳:۶۶۔۷۴

۲۸۔ندوی،تحفۂ پاکستان،ص:۴۱۔۵۱

۲۹۔ندوی،کاروان زندگی،۳:۱۷۱۔۱۷۸

۳۰۔ ندوی،کاروان زندگی، ۷:۵۳۔۵۷

تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ،دانشگاہ پنجاب،پنجاب یونیورسٹی،لاہور بذیل مقالہ ''ابوالحسن علی ندوی،۳۵۶۔